© rasailojaraid.com

کے تقاضوں سے بے خبر رکھا جاتا ہے' انھیں مارا جاتا ہے' زنجیروں سے باندھا جاتا ہے' ان سے جبری بے گاری لی جاتی ہے' ان کی خوراک' رہایش اور صفائی کا معیار ناقص ہے' انھیں مدارس میں آزادی رائے اور دیگر بنیادی حقوق حاصل نہیں ہیں' انھیں جان بوجھ کر ناقص رکھا جا رہا ہے تاکہ وہ قومی زندگی کے کسی شعبہ میں کھپ نہ سکیں' ان کے نام پر چندہ اکٹھا کر کے مدارس کے منتظمین کھا پی جاتے ہیں اور طلبہ کو انتہائی خستگی کی حالت میں رکھ کر خود عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں' اور ان مدارس میں طلبہ کو اسلحے کی ٹریننگ دے کر دہشت گرد بنایا جا رہا ہے"۔ (مولانا زاہد الراشدی' ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ' جنوری ۹۵' ص ۳۴)

پاکستان کی حکومت نے یہ حملہ جس سوچی سمجھی تیاری کے ساتھ شروع کیا ہے اس کا اندازہ صرف ایک بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ ادھر صوبائی حکومتوں کو کوائف جمع کرنے کا حکم ہوا' ادھر اگلے ہی دن (۲۴ جنوری) سے روزنامہ دی نیوز نے پنجاب کے مدارس کے کوائف اور ایک ایک مدرسے کو ملنے والی زکوٰۃ کی تفصیلات شائع کرنا شروع کر دیں۔ ظاہر ہے کہ یہ معلومات حکومت ہی نے فوری طور پر بہم پہنچائیں' ورنہ نامہ نگار خود ۲۴ گھنٹے میں یہ کارنامہ انجام نہ دے سکتا تھا۔ ساتھ ہی یہ سرخی بھی جمائی گئی کہ "مدارس لوہے کے چنے ثابت ہوں گے جو وزیراعظم سے چبائے نہ چبیں گے"۔ اگلے دن "دستوری ماہرین" کی بے سروپا آرا شائع کی گئیں کہ بیرونی امداد لینا دستور کی خلاف ورزی ہے۔ (پتہ نہیں کس دفعہ کی!)' ملکی قانون کے خلاف ہے' یہ خارجہ پالیسی میں مداخلت ہے (کیا ایک عالم دین کے امور خارجہ کمیٹی کا صدر بن جانے کی وجہ سے!)' مدارس تعلیمی ادارے نہیں کیونکہ وزارت تعلیمات نے انھیں منظوری نہیں دی ہے۔ اور ٹیپ کا بند' حکومت کو مشورہ کی صورت میں حکومت کی اپنی دھمکی: "زکوٰۃ فنڈ سے ملنے والی رقوم تو چشم زدن میں صرف ایک انتظامی حکم کے ذریعہ بند کی جا سکتی ہیں!"

شاید اس پر تعجب ہو ___ اگرچہ تعجب کی کوئی بات نہیں ___ کہ اسی انداز میں' انھی الفاظ میں' انھی بنیادوں پر' ایسی ہی مہم' دینی مدارس کے خلاف بھارت میں چل رہی ہے۔ ۲۱ نومبر ۱۹۹۴ کو آدھی رات کے بعد دہلی سے بھیجے گئے کمانڈوز اور پولیس نے ندوۃ العلما لکھنؤ کی مشہور درس گاہ پر چھاپا مارا' طلبہ پر تشدد کیا اور انھیں گرفتار کیا۔ اس سے ملتا جلتا واقعہ دارالعلوم دیوبند کے ساتھ بھی پیش آ چکا تھا۔ صورت حال کی تصویر کشی کرتے ہوئے آل انڈیا ملی کونسل کے تحت ایک کل ہند دینی مدارس کنونشن کے سامنے اپنے کلیدی خطاب میں قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کہتے ہیں: عین اس وقت جب ہم اپنی زبوں حالی پر آنسو بہا رہے ہیں اور مدارس اسلامیہ کی کمزوریوں کا محاسبہ کر رہے ہیں' دشمنانِ اسلام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انھی مدارس کو اپنے لیے خطرے کا سب سے بڑا مرکز سمجھ رہے ہیں... قال اللہ وقال الرسول کے گونجنے والے نغموں میں [انھیں] اسلام کی حیات نو کا خطرہ 'بنیاد پرستی کی نمو اور آئی ایس آئی کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ مدارس کو بدنام کرنے کے لیے انھیں کبھی اسمگلنگ کا اڈہ بتایا جاتا ہے اور کبھی ان کی جدید تعمیرات میں غیرملکی پیسے کا عمل دخل بتایا جاتا ہے... تہذیب اور لباس کی تبدیلی کو بڑی گہری نظر سے واچ کیا جا رہا ہے' اسے ایک بڑا خطرہ تصور کیا جا رہا ہے۔ مدارس کو آتنک وادیوں کا اڈہ اور ہتھیاروں کا بھنڈار تصور کیا جا رہا ہے... اصل خطرہ یہ بتایا جا رہا ہے کہ چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو ایسی تعلیم دی جا رہی ہے کہ بڑے ہو کر بنیاد پرست (فنڈامنٹلسٹ) اور عسکریت پسند بنیں گے' اور کسی کو یہ خوف ہے کہ جو طبقہ ان مدرسوں سے نکلے گا وہ اسلامی تشخص اور اپنی مذہبی شناخت کا سخت وکیل ہو گا"۔ (ماہنامہ الفرقان' لکھنؤ' نومبر۔ دسمبر ۹۴' ص ۱۴)۔

یہ خوف و خطر کچھ غلط بھی نہیں۔ مدرسوں سے جو نوجوان نکلیں گے وہ بالعموم اللہ اور اس کے رسول کی "بنیادوں" پر ایمان سے لبریز' اسلامی تشخص کے علم بردار' اور احیائے اسلام کے نشے سے سرشار ہوں گے' (اور یہی "بنیاد پرستی" ہے جو چبھتی ہے)' خواہ وہ فی الوقت اپنے مقصد کے لیے درکار کماحقہٗ اہلیت سے تہی دامن ہوں۔ مدارس کے خلاف مغرب کی دشمنی کوئی نئی چیز بھی نہیں: فرانس نے الجیریا میں اور روس نے وسط ایشیا میں مدارس کو ختم کیا' ہالینڈ نے انڈونیشیا میں اور برطانیہ نے ہندو پاکستان میں ان کو ختم کرنے یا مفلس و قلاش اور بے اثر بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اتاترک نے بھی' جب "مغربی" بننے کا فیصلہ کیا' خلافت ختم کر کے پہلا وار مدرسوں پر کیا' اور پھر عربی رسم الخط کو لاطینی سے بدل دیا' تاکہ دینی علوم سے رشتے کی کوئی سبیل ہی باقی نہ رہے۔

لیکن تاریخ کے اس مرحلے میں مغرب نے' اور مغرب کے باج گزار ان مسلمان حکمرانوں نے ۔۔۔ جو مغرب کے مقاصد پورے کرنے کے لیے اگلے مورچوں پر "دہشت گردی" (یعنی' اسلامی احیا) کے خلاف جان لڑانے کی پیشکش کر چکے ہیں ۔۔ مدارس اور علما کے خلاف جس شد و مد سے اپنی جنگ کا آغاز کیا ہے' اس کے اسباب اس خوف و خطر سے بہت زیادہ گہرے' دُور رَس اور بالکل بنیادی نوعیت کے (فنڈامنٹلسٹ) ہیں۔ ان کا تعلق مغرب اور اسلام کے درمیان اس تہذیبی کشکش سے ہے جس کے لیے تاریخ کا میدان گرم ہو رہا ہے۔

رہے وہ الزامات بظاہر جن کی بنیاد پر مدارس کے خلاف مہم کو عام آدمی کی نگاہ میں جائز ٹھہرانے کی کوشش کی جا رہی ہے' تو ان کے لچر' بے بنیاد اور مضحکہ خیز ہونے کا علم' ہم سے زیادہ خود الزام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لگانے والوں کو ہو گا۔

بے تحاشا تعداد، کثیر مالی امداد، اور اس کے غلط استعمال کا بہت ڈھنڈورا پیٹا گیا ہے۔ اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس وقت پورے پنجاب میں صرف تقریباً ۲ ہزار ۵ سو مدارس ہیں، جن میں کل ۲ لاکھ ۱۹ ہزار طلبہ پڑھ رہے ہیں۔ ان میں سے ۱۷ سو، یعنی ۶۵ فی صد مدارس حکومت سے کوئی زکوٰۃ فنڈ نہیں لیتے۔ گذشتہ سال تقریباً ۸ سو مدارس کو ۷ کروڑ روپے دیے گئے "یعنی اوسطاً" فی مدرسہ ۸۷ ہزار روپے یا ۷ ہزار روپے ماہانہ۔ اتنی رقم تو ایک کالج کے ایک سینیر لیکچرر کی تنخواہ بھی بن جاتی ہے۔ لاہور ضلع میں گذشتہ سال ۸۶ مدارس کو ۵۲ لاکھ روپے دیے گئے "یعنی اوسطاً" ۵ ہزار روپے ماہانہ۔ ان میں سے بھی اگر وہ ۸ مدارس نکال دیے جائیں جن کو ایک لاکھ سے زائد رقم دی جا رہی ہے، تو بقیہ کا اوسط مشکل سے ۳ ہزار ماہانہ بنے گا۔ گذشتہ ۹ برسوں (۱۹۸۴ تا ۱۹۹۳) میں دیے ہوئے فنڈز کا اوسط بھی یہی ہے، یعنی اخراجات کئی گنا بڑھ جانے کے باوجود فنڈز میں ایک پائی نہیں بڑھی۔

بیرونی امداد بالعموم وہاں مقیم پاکستانی باشندوں سے، کسی قدر مخیر حضرات اور اداروں سے، اور شاذ و نادر کسی حکومت سے ملتی ہے۔ حکومت نے کھوج کرید کر کے اس پہاڑ سے کیا چوہا برآمد کیا ہے؟ رحیم یار خان کے ۲۳ مدارس کو "مشرق وسطیٰ کے ایک والیِ ریاست" سے امداد ملی ہے۔ سوچیے کتنی؟ ۹۵ لاکھ روپے یعنی ۴ لاکھ روپے فی مدرسہ۔ رحیم یار خان کے حوالے سے یہ شخصیت شیخ زید کے علاوہ کس کی ہو سکتی ہے۔ کیا بھٹو خاندان پر ان کی فیاضی کی بارش کچھ کم ہوئی ہے کہ اس پر بھی اعتراض ہو۔ ایک فرقہ کے ۵۲ مدارس کو بیرونی "طاقتوں" نے امداد فراہم کی۔ کتنی؟ ایک ماہ میں ۳ لاکھ ۷۰ ہزار روپے یعنی ۱۷ ہزار روپے فی مدرسہ کی خطیر رقم۔ یہ حقیقت ہے بے تحاشا فنڈز دیے جانے کے الزام کی۔

مدارس کو بیرونی امداد ملے بھی تو اس پر اس حکومت کو اعتراض کرنے کا کیا حق ہے جو خود سراپا بیرونی امداد کی محتاج ہے، جو اپنا بال بال بیرونی قرضوں اور سرمایہ کاری کے سنہرے جال میں باندھتی چلی جا رہی ہے، اور جس کی ناک کے نیچے سیکڑوں عیسائی مشنری ادارے، اور این جی اوز کھلے بندوں باہر سے لاکھوں کروڑوں ڈالر وصول کر رہے ہیں، اور صرف فارن پالیسی میں نہیں بلکہ اندرونی پالیسیوں، تہذیب، ثقافت، سیاست، قانون، عدالت، مقدمات سب میں مداخلت کر رہے ہیں۔ کیا یہ خلاف دستور و قانون نہیں؟ اِلّا یہ کہ فارن پالیسی میں مداخلت سے مراد مغرب کی غلامی اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں مداخلت ہو۔

مدارس کی مالیات کے بارے میں حکومت ایک مخمصے میں گرفتار ہے۔ ایک طرف وہ زکوٰۃ کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معمولی رقوم اور بیرونی امداد پر شور مچا رہی ہے۔ دوسری طرف اسے اس بات کی بھی سخت تکلیف ہے کہ یہ مدارس چندوں سے کیوں چل رہے ہیں۔ دراصل تو وہ یہ چاہتی ہے کہ یہ مدارس ختم ہو جائیں یا پوری طرح اس کے کنٹرول میں آجائیں۔ یہ بات وہ کہہ نہیں سکتی۔ کنٹرول میں لینے کے لیے پیسہ بھی خرچ کرنا نہیں چاہتی' اور خرچ بھی کرے تو یہ جانتی ہے کہ اکثر و بیشتر مدارس اس کی امداد کے عوض اپنی آزادی کا سودا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ مولانا قاسم نانوتوی ؒ نے جب دارالعلوم دیوبند کے لیے ۸ نکاتی دستورالعمل تجویز کیا تو سرفہرست زیادہ سے زیادہ چندے کی فراہمی کو رکھا' تاکہ مدارس عوام کے بل پر چلیں' حکومتوں کے محتاج نہ ہوں۔

مدارس کے خلاف اقدامات کا اصل جواز تو فرقہ واریت اور دہشت گردی' باہم خون ریزی' خصوصاً مساجد میں' اور اسلحے کے استعمال اور فوجی تربیت کے خلاف کارروائی کے نام پر فراہم کیا گیا ہے۔ کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے برعکس' دینی مدارس میں نہ جھگڑے ہوتے ہیں نہ اسلحے کا استعمال' نہ ایک فرقے کے مدارس دوسرے فرقے کے مدارس سے دست و گریباں ہیں۔ فوجی تربیت کا اہتمام بھی شاید ہی کسی مدرسے میں ہو۔ لیکن دینی طالب علم فوجی تربیت کیوں حاصل نہیں کر سکتے۔ مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ "میں اس بارے میں معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے کو صحیح نہیں سمجھتا"۔ "فرقہ وارانہ جھگڑوں اور غیر قانونی اسلحے اور دہشت گردی کے ہم سخت خلاف ہیں۔ البتہ جہاد ایک دینی فریضہ ہے' جہاد کی تربیت کا اہتمام متعدد دینی مدارس میں کیا جاتا ہے' اور ان شاء اللہ یہ اہتمام جاری رہے گا" (البلاغ' فروری ۹۴' ص ۲۷)

فرقہ وارانہ دہشت گردی میں' مدارس نہیں' تنظیمیں ملوث ہیں۔ یہ دہشت گردی یقیناً مجموعی طور پر دینی طبقات کے دامن پر ایک سخت بدنما داغ ہے' ایک سنگین معاملہ ہے' لیکن اسے بڑھا چڑھا کر اچھالا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے فرقہ واریت کے نام پر جو خون ریزی ہو رہی ہے۔۔ یا کرائی جا رہی ہے تاکہ اہل دین پر ہاتھ ڈالنے کا جواز فراہم ہو۔۔ وہ ملک میں سیکولر سیاسی فرقہ واریت اور نسلی و لسانی تعصبات میں ہونے والی خون ریزی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ کراچی میں ۱۹۹۵ء کے پہلے ۲۷ دنوں میں ۲۰۶ افراد ہلاک ہوئے' جن میں زیادہ سے زیادہ ۵۸ افراد کی موت کو فرقہ واریت کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے' جبکہ یہ وہ مدت ہے جس میں اس نوعیت کی اموات سب سے زیادہ ہوئیں۔

جہاں تک مدارس کے تعلیمی نظام میں اصلاح اور تغیر و تبدل کی ضرورت کا تعلق ہے' اس سے کسی کو انکار نہیں۔ یہ ایک عظیم چیلنج ہے۔ ممکن ہے اس چیلنج کی وسعت کا پورا ادراک مدارس کے ارباب حل و عقد میں عام نہ ہو' لیکن اس کی ضرورت کا احساس کسی نہ کسی درجہ میں ہر جگہ موجود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ نصاب کی اصلاح تو آج کے چیلنج کا ایک بہت محدود حصہ ہے۔ لیکن نصاب کی اصلاح ہو یا دیگر اصلاحات، یہ مدارس کا اپنا کام ہے، وہی کریں گے تو کامیاب ہو گا۔ حکومت کی طرف سے نصاب مسلط کرنے کا خواب کبھی پورا نہ ہو گا۔ جس حکومت کا اپنا تعلیمی نظام زبوں حالی کا شکار ہے ــ جہاں پرائمری اسکولوں میں چھتیں اور فرنیچر نہیں، جہاں امتحانات ایک ایک سال موخر ہوتے ہوں اور نتائج چھ، چھ ماہ کے بعد آتے ہوں؛ جہاں ہر امتحان میں ساٹھ ستر فی صد طلبہ فیل ہوتے ہوں ــ وہ حکومت کس منہ سے مدارس کی اصلاح کا دعویٰ کر سکتی ہے۔

دیکھا جائے تو مدارس اور علما کا معاشرہ میں سیاسی، معاشرتی اور علمی و فکری اثر و رسوخ بہت محدود ہے۔ انتخابات میں ان کی کارکردگی مایوس کن ہے۔ حکومت کے مناصب ان کے پاس نہیں ہیں۔ فوج اور بیوروکریسی میں ان کا داخلہ بند ہے۔ عدلیہ میں گنتی کے چند افراد ہیں، لیکن سیکنڈ کلاس ججوں کی حیثیت میں۔ فرقہ وارانہ کشیدگی نے ان کا وقار اور مقام مزید گرا دیا ہے۔ بہت سے علاقوں میں مسجد کے امام کا مقام نیچے درجے کے کام کرنے والے کسی سے مختلف نہیں۔

پھر آخر ان مدارس سے مغرب اور مغرب کے مسلمان مہرے کیوں اتنا خائف ہیں؟ میڈیا، خصوصاً انگریزی میڈیا، ان کے پیچھے کیوں ہاتھ دھو کر پڑا ہے؟ مغرب کی شہ پر، اور از خود بھی، پاکستان کی حکومت ان کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں کیوں اتر رہی ہے۔

اس اہم سوال کا حقیقت پر مبنی جواب مشہور برطانوی ہفت روزہ اکنامسٹ نے اپنی ۶ اگست ۱۹۹۴ کی اشاعت میں فراہم کیا ہے۔ یہی وہ جواب ہے جو اس مسئلے کے بنیادی اور دُور رَس پہلوؤں کے چہرے سے نقاب اٹھا دیتا ہے۔

"اسلام کا سروے" نام کے طویل مضمون کا خلاصہ یوں ہے:

۱۔ دنیا کی قیادت کی حقیقی دعوے دار دو ہی تہذیبیں ہیں: مغرب اور اسلام۔

۲۔ اسلام ایک آئیڈیا ہے: آج کی دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد آئیڈیا، شاید اس نوعیت کا آخری آئیڈیا جو دنیا دیکھے [یا کم سے کم اسے آخری بنانا مغرب کا مشن ہونا چاہیے!]۔ آئیڈیا جو انسانی تجربے و مشاہدے سے ماوراء حق پر یقین کا مدعی ہے۔ یہ "الحق" اللہ کا کلام ہے، جس کا لفظ لفظ ۱۴۰۰ سال پہلے، عرب کے ایک گرد آلود کونے میں، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوا، اور انھوں نے اسے قرآن میں نقل کر دیا۔ یہ آئیڈیا انسان کی باطنی زندگی اور پبلک زندگی کے درمیان، مذہب اور سیاست کے درمیان کوئی سرحد تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳- ایک تہذیب کو جوڑے رکھنے کے لیے الحق پر یقین کی قوت کا کوئی بدل نہیں، کہ اس سے طاقت ور کوئی قوت نہیں۔ مزید ستم یہ --- یہ ماجرا اور کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آ رہا --- کہ یہ نئے لوگوں کو بھی کھینچ رہا ہے اور الحق کے دعوے پر مبنی اس تہذیب میں شریک بننے کے لیے لوگ ہجوم کر رہے ہیں۔

۴- لہٰذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ دوسری قومیں، خصوصاً یورپین، اسلام اور مسلمانوں سے خوف زدہ ہیں۔ انھیں خطرہ ہے کہ ایک نئی سرد جنگ آ رہی ہے، جو غالباً "سرد" نہ رہے گی۔

۵- لیکن کوئی وجہ نہیں کہ مغرب اور اسلام امن و آشتی کے ساتھ باہم گزر نہ کر سکیں۔ دونوں میں بہت کچھ مشترک ہے۔ بس اس مقصد کے لیے دونوں کو حکمت کے ساتھ معاملہ کرنا ہو گا، اپنے خیالات اور تصورات پر نظرثانی بھی کرنا پڑے گی۔ خاص طور پر مسلمانوں کو، جنھیں کوئی ایسا راستہ تلاش کرنا ہو گا جس کے ذریعہ وہ ماڈرن زندگی کے تین پہلوؤں سے ضرور ہم آہنگ ہو جائیں، یعنی ماڈرن بن سکیں: ۱- معیشت، ۲- عورت، ۳- جمہوریت۔

۶- معیشت میں سود کے بغیر گزر نہیں، اگرچہ اسلام کے مشارکت، مضاربت کے نظام سے مغرب بھی کچھ سیکھ سکتا ہے ("کاش، علماے قرآن کے پاس اکنامکس کی ڈگریاں ہوتیں!")۔

۷- عورت کو آزاد کرنا ہو گا۔ اس کے لیے اسے معاشی طور پر خود کفیل بنانا ہو گا۔ "مغرب سے جتنے انقلابات پھوٹے ہیں، ان میں سب سے عظیم انقلاب عورت اور مرد کے تعلقات میں انقلاب ہے۔ اسلام نے اس کو اختیار نہ کیا، تو وہ تنہا رہ جائے گا"۔

۸- سب سے بڑی تبدیلی، خود کو ماڈرن بنانے کے لیے، جو اسلام کو کرنا ہو گی، وہ "جمہوریت" کا اختیار کرنا ہے۔ جمہوریت [ایسے سیاسی نظام کے معنوں میں نہیں جہاں حکمرانوں کے عزل و نصب اور امور اجتماعی کے فیصلے رائے عامہ سے ہوتے ہوں، بلکہ ایسے فلسفے کے پیرو معاشرے کے معنوں میں] جو کسی الحق، حتمی سچائی، پر ایمان و یقین کی بنیاد پر قائم نہ ہو، یا کم سے کم کسی کو دوسرے پر اپنا ایمان و یقین مسلط کرنے کی اجازت نہ دے، جہاں ہر شخص کو یہ فیصلہ کرنے کا اختیار ہو کہ کیا نیکی ہے اور کیا بدی، کیا جائز ہے اور کیا ناجائز۔ "الحق" کے تصور اور مقام کو مسترد کر کے ہی تو مغرب میں جمہوریت پیدا ہوئی۔

۹- عورت کی آزادی ہو، یا فرد کی آزادی، [ہدایت الٰہی پر یقین اور اس کے اتباع سے] یہ آزادی ممکن نہیں جب تک ایک ادارہ بالکل بدل نہ دیا جائے: یعنی علماے اسلام کا ادارہ: "تعداد میں قلیل، اول تا آخر مرد ہی مرد، خود ساختہ، اور منشاے الٰہی بتانے کا حق رکھنے کے مدعی"۔ علما کا اصل ہتھیار ہے اجتہاد: قرآن صداے الٰہی ہوا کرے، اس کی صرف ۸۰ آیات قوانین و ضوابط کے بارے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں کچھ کہتی ہیں، وہ بھی محتاج تشریح ہیں، تشریح و اجتہاد کا حق، اجماع کا حق، علما نے صدیوں سے ہائی جیک کیا ہوا ہے۔ "بدقسمتی سے مسلمان آج بھی قرآن کی تعبیر و تشریح علما کے اس چھوٹے سے گروہ کے ہاتھوں میں چھوڑے رکھنے کے لیے تیار ہیں، اور یہ یقین بھی رکھتے ہیں کہ صرف ان ہی کی تعبیر آزادانہ ہوتی ہے"۔ وہ اب تک علما سے "نہیں (No)" کہنے کی ہمت نہیں کر پا رہے۔ چنانچہ "اسلام ابھی تک ایک قلیل، مطلق العنان گروہ کی بالادستی کی دنیا میں رہ رہا ہے۔ یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ وہ اب بھی "الحق" کے وجود پر یقین رکھتا ہے"

۱۰۔ علما "عورت کی آزادی" کو روکے بیٹھے ہیں۔ انھوں نے صدیوں پیش تر عورت کے مقام کے بارے میں غلط اجتہاد کیا، اب بھی کیے جا رہے ہیں۔ اس لیے اگر اسلام عورت کو وہ مساوات دینا چاہتا ہے جو "کم و بیش" قرآن نے دی ہے، تو اسے علما کی گرفت اور قوت کو توڑنا ہو گا۔

۱۱۔ اسی طرح جمہوریت کے فلسفے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھوڑے سے علما کی بالادستی ہے، جو خدا کی ترجمانی کے مدعی ہیں۔ عیسائی چرچ کی طرح بے شک نہیں، مگر اسلام میں بھی ائمہ، علما اور مفتیوں کا ایک نظام ہے، اور اس "تھکے ماندے، مصالحت پسند اور ذلیل نظام" کو ختم کیے بغیر اسلام کی قدیم پرجوش قوت کا احیا نہیں ہو سکتا۔ خدا کس چیز کی اجازت دیتا ہے، کس چیز سے منع کرتا ہے، اس کا فیصلہ کرنے کا حق اب علما کے محدود ادارہ سے سارے مسلم عوام کی طرف منتقل ہو جانا چاہیے۔

[بدقسمتی سے اسلام کی پہلی صدی میں کوئی سینٹ پال پیدا نہیں ہوا جو دین کو شریعت کے شکنجے سے آزاد کر دیتا، لیکن] اب اسلام کی پندرھویں صدی میں ریفارمیشن کی لہر ناگزیر ہے، عیسائیت کی پندرھویں صدی کی طرح، جس کے نتیجے میں مارٹن لوتھر نے ۱۵۱۷ میں چرچ کے دروازے پر اپنے مطالبات آویزاں کر کے یورپ میں پادریوں کے اقتدار کے تابوت میں پہلی کیل ٹھونک دی تھی۔

تجزیہ نگار کی تحریر کم علمی، خود ساختہ مفروضات، اور مغالطہ آمیز نتائج کا مرقع ہے۔ ان پر گفتگو کی یہاں گنجایش نہیں۔ لیکن چند وضاحتیں ضروری ہیں:

اسلام میں قرآن مجید کی تعبیر و تفسیر اور تنفیذ کی امانت کسی چرچ کی نہیں، امت کی تحویل میں دی گئی ہے۔ عالم و مفتی، پادری کی طرح کا منصب نہیں، بلکہ ایک اہلیت کا نام ہے۔ عالم کون ہے، اس کی بھی کوئی متعین تعریف نہیں۔ کوئی عالم تعبیر کے حق پر اپنے اجارہ کا مدعی نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ جب فتویٰ لکھتا ہے تو یہ ضرور لکھتا ہے کہ "یہ میری رائے ہے"، "علم صرف اللہ کے پاس ہے"، وہی صحیح جانتا ہے"۔ کسی عالم کے پاس نہ پہلے اتنا اقتدار رہا ہے کہ وہ اپنا اجتہاد دوسروں پر مسلط کر دے، نہ اب ہے۔ مگر کوئی حکومت بھی، اقتدار کے باوجود، اپنی تعبیر لوگوں پر مسلط نہیں کر سکی ہے، نہ آیندہ کر سکے گی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حقیقت یہ ہے کہ پہلے دن سے، عام مسلمانوں نے جن علما پر اعتماد کیا، انھی کو، اور انھی کے اجتہاد و تعبیر کو ہمیشہ سند قبول اور بقا حاصل ہوئی۔ یہ "جمہوری حق" تو، بغیر ہیلٹ کے، نیچے عوام ہی کے پاس رہا ہے۔ مگر تلخ حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف آج کی ماڈرن تعبیرات ہیں جو اتاترک، جمال عبدالناصر اور ایوب خان جیسے فوجی ڈکٹیٹروں نے اوپر سے نافذ کی ہیں۔ وہ تعبیرات جن کے بارے میں تجزیہ نگار یہ آس لگائے ہوئے ہے کہ "عوامی اجتہاد" ہو تو وہ نیچے سے نافذ ہوں گی۔

بے شک ۱۴۷۰ میں بائبل پہلی دفعہ چھپ کر عیسائیوں کے ہاتھ آئی تو انھیں پتہ چلا کہ اس میں کیا لکھا ہے، اور نتیجتاً ریفارمیشن کی لہر پیدا ہوئی۔ مگر قرآن مجید تو روز اول سے مسلمانوں کے سینوں اور ہاتھوں میں رہا ہے۔ اور اب ۱۴۱۵ھ تک پہنچتے پہنچتے تو صدیاں ہوگئیں کہ تقریباً ہر زبان میں لوگ اس کا ترجمہ پڑھ رہے ہیں لیکن مضمون نگار اس کی کیا توجیہ کرے گا کہ لوگ جتنا زیادہ قرآن پڑھتے ہیں، اتنا ہی زیادہ وہ ریفارمیشن کے بجائے فنڈامنٹلزم کی طرف لپکتے ہیں۔

اس تجزیے سے یہ بات ضرور روز روشن کی طرح آشکار ہوتی ہے کہ مغرب مدارس کو ایک خطرہ عظیم اس لیے سمجھتا ہے کہ اس کی نظر میں اس کے تہذیبی غلبہ اور قیادتِ عالم کی بقا، اور تہذیبی جنگ میں اسلام کے اوپر (اس کو مغرب کے رنگ میں رنگ کر) فتح کی راہ میں مدارس ایک بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔ کیونکہ دینی تعلیم ہی سے مسلمانوں کے اندر کائنات میں الحق کے وجود، اور قرآن اور رسالت محمدی کے الحق ہونے پر یقین، ۱۴سو سال سے زندہ اور قائم ہے، اور الحق کے ساتھ ربط بھی۔ ملت کی وحدت، قوت اور توسیع کا راز اس یقین میں پوشیدہ ہے، اور اس یقین کی قوت کا کوئی جواب مغرب کے پاس نہیں۔

ہندو پاکستان میں تعلیم کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے ولیم ہنٹر نے انیسویں صدی میں اسی بات کا اظہار یوں کیا تھا: "شرع محمدی" کو ہرگز تعلیم کا مقصد نہ بنانا چاہیے کیونکہ شرع محمدی "کا مطلب ہے مسلمانوں کا مذہب، اور مذہب بھی اس زمانے کا جب اس کے پیرو تمام دنیا کو اپنی جائز شکار گاہ سمجھتے تھے اور انھوں نے زمانہ حال کی مسلمان آبادیوں کی طرح عیسائیوں کے ساتھ اتحاد کر کے یا ان کی رعایا بن کر رہنا نہ سیکھا تھا"۔

اب یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ دینی مدارس کے خلاف مغرب کی مہم، خواہ آج ہو جب وہ ہمارے اوپر ہمارے حکمرانوں کے واسطے سے مسلط ہیں، یا ماضی میں جب وہ براہ راست مسلط تھے، ایک عظیم تہذیبی جنگ میں کلیدی مقام رکھتی ہے۔ افسوس ان مسلمان حکمرانوں، دانش وروں اور انگلش میڈیا پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے جو مغرب سے بڑھ کر مغرب کی وفاداری کی روش پر گامزن ہیں' اور شرع محمدی کی تعلیم کو بے اثر یا ختم کرنے کے درپے ہیں۔ شاید وہ ایک مرتبہ پھر عیسائیوں کی "رعایا" بن کر رہنے کا فیصلہ کر چکے ہیں' اور ساری امت کو بھی یہی سبق سکھانا چاہتے ہیں۔

جب برصغیر میں پہلی بار بیرونی آقاؤں کی طرف سے مسلمانوں کو عیسائیوں کی رعایا بن کر رہنے کا سبق سکھانے کی مہم شروع ہوئی' تو علما نے آگے بڑھ کر اس حملہ کے خلاف دفاعی بند باندھا' اور ملک کے طول و عرض میں مدارس کا جال بچھا دیا۔ اس دفاعی مہم میں ۳ مئی ۱۸۶۷ / ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ کو دارالعلوم دیوبند کا قیام ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی' اور جس زور و شور کے ساتھ مغرب کے سیاسی و تمدنی غلبے کا سیلاب آرہا تھا' اس کو دیکھتے ہوئے ان مدارس کے بانیوں نے جو منصوبہ بنایا اور خدمات انجام دیں شاید اس سے زیادہ کچھ سوچنا اور کرنا کسی کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس لیے آج کی دنیا میں بیٹھ کر کل کی دنیا کے بارے میں رومانوی فتوے صادر کرنا --- کہ یہ ہونا چاہیے تھا' اور یہ خامی تھی --- ایک بے سود مشغلہ ہے۔

دینی مدارس نے علوم نبوت کے تحفظ' ان کی تعلیم و اشاعت' ان میں اضافہ و ترقی' اور مغربی افکار و تمدن کا جواب دینے میں جو شاندار خدمات انجام دی ہیں ان کا اعتراف نہ کرنا اور انھیں خراج تحسین پیش نہ کرنا بخل ہو گا۔ لیکن ایک زندہ قوم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ہر کوشش اور ہر معرکے کا جائزہ لے' کوتاہیوں اور خامیوں کا تعین کرے' اصلاح و بہتری کی فکر کرے اور اسے مستقبل کے تقاضے پورے کرنے کا اہل بنائے۔ مَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِیْٓ اَمْرِنَا ..... الخ۔ (آل عمران ۳: ۱۴۷) پھر' آج تو مدارس کو ایک بالکل نئی نوعیت کا اور کہیں زیادہ بڑا چیلنج درپیش ہے۔ اسلام اور مغرب کے درمیان معرکہ برپا ہونے والا ہے۔ دشمن نے مدارس کو اپنے اہداف میں سرفہرست رکھا ہے۔ مستقبل بے شک بڑا پُرخطر ہے' لیکن عظیم الشان امکانیات سے بھرپور بھی۔ ملت کے احیا' امت کے مشن کی تکمیل' اسلام کے تہذیبی غلبے' دنیائے اسلام کے لیے روشن مستقبل اور انسانیت کے لیے امن و سلامتی کی زندگی کی امکانیات۔

مغرب نے اسلام اور مسلمانوں کو دشمن تو قرار دے لیا ہے' مگر ملت جس پستی و درماندگی' ضعف و انحطاط' تفرقہ و انتشار' علمی و فکری جمود اور معاشی بدحالی و سیاسی عدم استحکام کا شکار ہے' اس کو دیکھتے ہوئے' عالم اسباب کی حد تک' سمجھ میں نہیں آتا کہ مقابلہ کیسے ہو گا۔ اسی طرح دشمن نے مدارس کو اپنے اہداف میں سرفہرست رکھ تو لیا ہے' لیکن یہ تصور کرنا بھی دشوار ہے کہ اپنی خامیوں' کوتاہیوں اور قلتِ وسائل کے ساتھ وہ دشمن کے مقابلے میں کیسے کامیاب ہوں گے۔ لیکن دنیا میں تاریخ کی کوئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کروٹ سلسلۂ اسباب کو دو اور دو چار کی طرح جمع کرنے کے نتائج پر منحصر نہیں ہوتی۔

مدارس کہاں کھڑے ہیں، اور انھیں کیا کرنا چاہیے، اس موضوع پر ان شاء اللہ دینی تعلیم سے متعلق علما و مفکرین کی قدیم و جدید تحریروں سے مرتب کر کے ایک قلمی مذاکرہ ہم جلد قارئین کے سامنے پیش کریں گے۔ آج ہم انتہائی ادب کے ساتھ صرف چند جامع بنیادی امور کی طرف مدارس کے اربابِ حل و عقد کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں:

۱- ۱۸۵۷ کے بعد دینی تعلیم کی حکمتِ عملی دفاعی حکمتِ عملی تھی، اس کا اصل اور بنیادی مقصد "تحفظ" تھا۔ قاری محمد طیبؒ لکھتے ہیں: "اجماع اس پر منعقد ہو گیا کہ ایک دینی مدرسہ قائم کیا جائے تا کہ اس ملک میں مسلمانوں کا دین محفوظ ہو جائے"۔ لیکن اس میں یہ تمنا بھی شامل تھی کہ "گو ان کی اسلامی شوکت پامال ہو چکی ہے، لیکن اگر دین اور دینی جذبات محفوظ ہو جائیں گے، تو ایسا وقت آنا بھی ممکن ہے کہ وہ ان دینی جذبات سے رہتی دنیا کو بھی سنوار سکیں" (ماہنامہ الرشید، دارالعلوم نمبر، لاہور، ص ۱۳)

یہ اور اک سب سے زیادہ ضروری ہے کہ وہ وقت آگیا ہے۔

تحفظ علومِ نبوت کے ورثے کا بھی مطلوب تھا، مسلمانوں کے دین و ایمان کا بھی۔ خدا کے فضل سے اس مقصد میں کافی کامیابی ہوئی۔ یہ کامیابی، اپنی تمام کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود، انھی مدارس کے ذریعے ممکن ہوئی، کہ دورِ انحطاط میں تقلید کا نسخہ ہی کارگر ہو سکتا ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا:

> ان مکتبوں (مدرسوں) کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو انھی مدارس میں پڑھنے دو۔ اگر یہ مُلّا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہو گا؟ جو کچھ ہو گا میں انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ اگر ہندستانی مسلمان ان مدرسوں کے اثر سے محروم ہو گئے تو بالکل اسی طرح ہو گا جس طرح اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود۔۔ اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا۔

تحفظ کا مقصد اب بھی مطلوب رہے گا، لیکن اب معاملہ دفاع سے بہت آگے چلا گیا ہے۔ آج ایک بالکل نئی حکمتِ عملی کی ضرورت ہے، جس کا مرکزی نکتہ "اقدام" ہونا چاہیے۔ ایمان، رسوخ فی العلم، حکمت، اجتہاد اور جہاد، اس حکمتِ عملی کے لازمی اجزا ہوں گے۔ علامہ اقبال کو دورِ جدید کے اس چیلنج کا بھی شدت سے احساس تھا، اور نظم و نثر میں انھوں نے اس بارے میں اپنے اضطراب کا شدت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ساتھ اظہار کیا ہے۔

۲۔ علمی و فکری اور تہذیبی سطح پر مغرب نے بے شمار انقلابات برپا کیے ہیں۔ روز نت نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں، ان کا علم اور فہم و ادراک نہایت ضروری ہے۔ اور ایمان و حکمت اور اجتہاد کے ساتھ ان کا مقابلہ اور ان کے مقابلے میں جوابی انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت اور جدوجہد بھی اتنی ہی ضروری ہے۔ تفقہ فی الدین کا مطلب صرف احکام و مسائل کا علم نہیں، حکمت اور مجتہدانہ نظر و صلاحیت بھی ہے۔

۳۔ تفقہ فی الدین کا ناگزیر تقاضا انذار عام ہے (التوبہ)۔ انذار عام کی صلاحیت اور کاوش کے بغیر امت نہ مغرب کے مقابلے کے لیے تیار ہوگی، نہ شریعت کا 'قول ثقیل' کا بار اٹھانے کی استعداد اس کے اندر پیدا ہوگی۔

۴۔ امت میں اتحاد و اخوت کے بغیر علم کی بڑی سے بڑی مقدار بھی غیر موثر رہے گی۔ تعبیر، تشریح، فتاویٰ، رد و قدح، اختلافات، سب میں اس بنیادی مقصد کے لیے صلاحیت پیدا کرنا اور مناسب حکمت عملی اختیار کرنا ضروری ہے۔

ان چار نکات کی وسعت میں ہر چیز سما سکتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہماری یہ گزارشات واجب الاحترام علما اور دینی مدارس کے ارباب حل و عقد کے لیے قابل توجہ قرار پائیں گی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اقامتِ دین اور جماعتی زندگی

ایک بزرگ عالمِ دین جماعت کی دعوت اور طریق کار کو عین حق سمجھتے ہیں اور جماعت کے باقاعدہ متفق بھی ہیں' ان کا خیال ہے کہ فریضہ اقامت دین فرضِ عین نہیں بلکہ فرضِ کفایہ ہے۔ اس لیے جب کچھ لوگ حصہ لے رہے ہیں تو کوئی ضروری نہیں کہ اس میں ہر ایک شخص حصہ لے۔ اگر کسی شخص کی دنیوی مصلحتیں اسے اس کام سے روکتی ہیں اور وہ اقامت دین کے لیے کوئی کام نہیں کرتا' تو اس سے اللہ تبارک و تعالیٰ کے یہاں کوئی مواخذہ نہیں ہو گا۔

رہی جماعت کی تنظیم' اس سے منسلک ہونا' اس کے امیر کی اطاعت' اس راہ میں آنے والی مشکلات پر صبر اور اس نصب العین کے لیے ہر قسم کی جانی و مالی قربانیاں' تو ان امور کو وہ بالکل نوافل کا درجہ دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ صاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ یہ امور تو ایسے ہیں جیسے نماز تہجد۔

وہ کہتے ہیں ایسی مختلف تنظیمیں جو مختلف ادوار اور مختلف ممالک میں دین کا کام کرنے کے لیے قائم ہوں' ان کے نظم کی پابندی اور اس کے اولو الامر کی اطاعت فرض نہیں ہے۔ اطاعت تو رسول اللہ ؐ اور خلفاے راشدین ؓ کی فرض تھی نہ کہ ایسی جماعتوں کے امرا کی۔

جن عالمِ دین کا یہ خیال ہے ان کو غلط فہمی یہ ہے کہ اقامتِ دین کی سعی ہر حال میں صرف فرض کفایہ ہے۔ حالانکہ یہ فرض کفایہ صرف اسی حالت میں ہے جب کہ آدمی کے اپنے ملک یا علاقے میں دین قائم ہو چکا ہو' اور کفار کی طرف سے اس دار الاسلام پر کوئی ہجوم نہ ہو' اور پیشِ نظر یہ کام ہو کہ آس پاس کے علاقوں میں بھی اقامت دین کی سعی کی جائے۔ اس حالت میں اگر کوئی گروہ اس فریضے کو انجام دے رہا ہو تو باقی لوگوں پر فرض ساقط ہو جاتا ہے' اور معاملہ کی نوعیت نماز جنازہ کی سی ہوتی ہے۔

لیکن اگر دین خود اپنے ہی ملک میں مغلوب ہو' اور خدا کی شریعت متروک و منسوخ کر کے رکھ دی گئی ہو' اور علانیہ منکرات اور فواحش کا ظہور ہو رہا ہو' اور حدود اللہ پامال کی جا رہی ہوں' یا اپنا ملک دار الاسلام تو بن چکا ہو مگر اس پر کفار کے غلبے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہو' تو ایسی حالتوں میں یہ فرض کفایہ نہیں بلکہ فرض عین ہوتا ہے' اور ہر وہ شخص قابلِ مواخذہ ہو گا جو قدرت و استطاعت کے باوجود اقامتِ دین اور حفاظتِ دین کے لیے جان لڑانے سے گریز کرے گا۔

اس معاملے میں کتب فقہ کی ورق گردانی کرنے سے پہلے صاحبِ موصوف کو قرآن مجید پڑھنا

© rasailojaraid.com